فکر و نظر............ اسلام آباد　　جلد: ۴۶　　شمارہ: ۳

تعارف و تبصرہ کتب

نام کتاب : اُردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پسِ منظر

نام مصنف : سیّد محمد ابوالخیر کشفی

نام پبلشر : نشریات، ۴۰ اُردو بازار، لاہور

قیمت : ۲۴۰ روپے

تبصرہ نگار : پروفیسر فتح محمد ملک☆

پروفیسر ڈاکٹر سیّد محمد ابوالخیر کشفی ہمارے ادبی اُفق پر طلوعِ پاکستان کے جلو میں نمودار ہوئے تھے۔ اِن کا پہلا مقالہ رسالہ ''ہمایوں'' لاہور میں ۱۹۴۸ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ابھی کشفی صاحب مرحوم و مغفور انٹرمیڈیٹ کے طالب علم تھے۔ اُن کے مجموعۂ مقالات بعنوان ''تنقیدی سرگوشیاں'' میں شامل فراق گورکھپوری کی کتاب ''روپ'' کی رباعیات کے تجزیہ و تحسین پر مشتمل یہ مضمون تنقیدی بصیرت اور جرأت اظہار کی ایک روشن مثال ہے۔ آج بہت سے قارئین ادب کو یہ حقیقت تسلیم کرنے میں تأمل ہوگا کہ یہ عمدہ تحریر انٹرمیڈیٹ کے ایک طالب علم کے قلم سے نکلی ہے۔ ہر چند ''روپ'' کی رباعیات میں فراق گورکھپوری جسم و جسمانیت کے جمال اور جادو میں مبتلا نظر آتے ہیں تاہم نوجوان طالب علم اِن رباعیات کو حیرت انگیز فکری پختگی کے ساتھ تجزیہ و تنقید کی کسوٹی پہ پرکھتا ہے۔ اپنے اسی مجموعۂ مقالات، ''تنقیدی سرگوشیاں'' کے ابتدائیہ میں کشفی صاحب نے اپنے تنقیدی مسلک کو درج ذیل الفاظ میں بیان کیا ہے:

> ''میری تنقید کو دوستوں اور مبصروں نے تاثراتی اور جمالیاتی کہا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ میری تحریروں میں شخصی رنگ غالب ہے لیکن آدمی کے تأثرات اس کا ماحول، مطالعے اور اس کے دور کے علمی و ادبی منظر کا عکس ہوتے ہیں لیکن ادب کی تفہیم اور تعبیر میں، میں نے شاعر کے احوال، اس کے دور اور سماجی علوم کو کبھی نظرانداز نہیں کیا۔ ادب کی تفہیم میں، میں نے دین اور عمرانیات کو بھی اہمیت دی ہے۔ میں اپنی تنقید کو انتخابی اور امتزاجی قرار دیتا ہوں۔ میں ادب اور تنقید کو زندگی سے ہم رشتہ کرنے کا قائل ہوں۔ زندگی کے تجربات اور اقدارِ حیات کو ادب کے تناظر میں اور ادب کو اقدار کے تناظر میں دیکھتا

☆ ریکٹر، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

DMHL

© Dr Muhammad Hamidullah Library, IIU, Islamabad.　　http://iri.iiu.edu.pk/

ہوں‘‘۔ (تنقیدی سرگوشیاں، ص ۱۱)

اپنے زمانے کی ادبی تنقید میں کشفی صاحب کی خاص عطا دینیات اور عمرانیات کو از سرِ نو ادب کی قلم رو میں شامل کر دینے سے عبارت ہے۔ اس باب میں اُن کا مقالہ ’’مولانا مودودی کی ادبی شخصیت‘‘ ہماری عصری تنقید میں ایک یادگار حیثیت کا حامل ہے۔ مقالے کے آغاز ہی میں وہ دینیات اور عمرانیات کو دائرہ ادب سے خارج قرار دینے کے ادبی رجحان کو یوں تنقید کا نشانہ بناتے ہیں:

’’مولانا مودودی کی ادبی حیثیت پر کچھ لکھنے سے پہلے ایک خطرناک ادبی رجحان کی نشان دہی ضروری سمجھتا ہوں اور وہ یہ کہ کسی تنقیدی کتاب یا جائزہ کو دیکھ لیجئے کہ نثر نگاروں کے ضمن میں اسلام پر لکھنے والے کسی زندہ ادیب کا حال آپ کو شاید ہی کہیں نظر آئے۔ یہ خطرناک رجحان ۱۹۳۶ء کے لگ بھگ شروع ہوا اور اس کا سلسلہ ختم ہونے ہی کو نہیں آتا۔ حالانکہ جدید نقادوں میں کتنے ہی ایسے ہیں جو اسلامی نظریات پر ایمان رکھتے ہیں۔

بات یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ اس میں ہمیں ایک نہایت ہی شدید تضاد نظر آتا ہے۔ سرسید جدید ادب کے بانی قرار دیے جاتے ہیں۔ وہ سرسیّد جن کی تصنیفی زندگی کے اہم ترین کارنامے خطبات احمدیہ اور تفسیر قرآن ہیں۔ صاحب سیرت النبیؐ و الفاروق شبلی جدید نثر کی زندہ قوت کا درجہ رکھتے ہیں۔ حالی کے دینی مقالات ادب کے زمرہ میں شامل کیے جاتے ہیں۔ نذیر احمد کے دینی لیکچر اور امہات الامہ ادب کی کتابیں ہیں۔ حسن نظامی کی مذہبی تحریروں کو ادب کے دائرے سے نکالنے کی مجال بھلا کسے ہے۔ مولانا ابوالکلام کے مذہبی مقالات اور تفسیر ادب کی تاریخ کا باب ہے، لیکن (اور یہ لیکن بہت اہم ہے) ان بزرگوں کے بعد سے اب تک جو لوگ دینی موضوعات کو اپنا سرمایہ دین و دنیا اور زادِ راہ ادب سمجھتے ہیں، ان کے ذکر سے دامن بچایا جاتا ہے۔ اگرچہ ان کی تحریروں میں ادب کے بت ہزار شیوہ کی کتنی ہی ادائیں موجود ہیں۔ اس فہرست میں مولانا مودودی، مولانا مناظر احسن گیلانی، جناب غلام احمد پرویز، مولانا امین احسن اصلاحی، خلیفہ عبدالحکیم، مظہر الدین صدیقی اور نعیم صدیقی کے نام زیادہ نمایاں ہیں۔

مجھے یہ تسلیم ہے کہ ادبی تاریخ میں جگہ پانے کے لیے ادبی شان اور اسلوب ضروری ہے۔ میں نے کہیں مولانا حسین احمد مدنی اور اشرف علی صاحب تھانوی کا ذکر نہیں کیا ہے۔ ادبی تاریخ میں ان بزرگوں کی شمولیت پر میں زور اس لیے نہیں دے رہا ہوں کہ یہ لوگ اللہ کے دین کی خدمت کر رہے ہیں، بلکہ اس لیے کہ ان کی تحریروں سے ہمارے ادب میں وسعت پیدا ہوئی ہے۔ ہماری زبان کا فکری پایہ بلند ہوا ہے، ہم پر اس حقیقت

کا اظہار ہوا ہے کہ نظریہ کے بغیر ادب میں قوت اور عظمت پیدا نہیں ہوتی، خواہ وہ نظریہ اسلام ہو یا جمہوریت یا اشتراکیت۔ اسی لیے یہ بات ایک ادبی سازش ہے کہ اشتراکیت یا ادب کے چند عمومی پہلوؤں پر دو ایک مقالے لکھ کر ڈاکٹر عبدالعلیم اور سبطِ حسن تو ادیبوں کی صف میں جگہ پا لیں اور وہ لوگ جن کی فکر و نظر کا سرمایہ ہزاروں صفحات پر پھیلا ہوا ہمیں دعوت فکر و نظر دیتا ہے، ان کے وجود کو ہم تسلیم نہ کریں۔ ادب میں اس تنگ نظری کی گنجائش نہیں۔

اس رجحان کا دوسرا افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ ہم نثری ادب کو ناول، افسانہ، ڈرامہ، تنقید وغیرہ چند اصناف تک محدود کیے دے رہے ہیں۔ یہاں بھی یہ تضاد ملاحظہ ہو کہ گنجِ خوبی (میر امن)، تاریخ ہندوستان (ذکاء اللہ)، الکلام (شبلی) وغیرہ کو ہم اپنا ادبی سرمایہ اور تہذیبی میراث گردانتے ہیں۔ ادب کی نئی حد بندی سے ہمارا ادب محدود ہوتا جا رہا ہے اور ہم اس کا احساس بھی نہیں کرتے۔ (تنقیدی سرگوشیاں، ص ۱۴۸ تا ۱۵۰)

خلافِ معمول، میں یہ طویل اقتباس دینے پر اس لیے مجبور ہوا ہوں کہ سیّد محمد ابوالخیر کشفی ہماری عصری تحقیق و تنقید کی دنیا کی وہ تنہا شخصیت تھے جنھوں نے ادب کی سکڑتی ہوئی حدود کا احساس کیا اور پھر ایک مضبوط اور مؤثر استدلال کے ساتھ اُن شخصیات کو دوبارہ ہماری ادبی زندگی میں بحال کیا جنہیں سن چھتیس کی ادبی تحریکوں نے ادب اور تہذیب کے دائرے سے نکال باہر کرنے کی سعی نامشکور فرمائی تھی۔ میں نے یہ ضروری سمجھا کہ اس اہم موضوع پر کشفی صاحب مرحوم کے پورے کے پورے استدلال کو قارئین ادب کے سامنے پیش کر دوں اور پھر بتاؤں کہ کشفی صاحب نے بڑی خوبی کے ساتھ مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی کے اسلوب کو سرسیّد احمد خان کے اسلوب کی ایک ارتقاء یافتہ صورت قرار دیا ہے۔ ہمارے ادبی آفاق کی قدرتی حدود کی بازیافت کے اس عمل میں اگر ایک طرف کشفی صاحب سیّد ابوالاعلیٰ مودودی کی نثر کے فنی اور جمالیاتی حسن کو اجاگر کرتے ہیں تو دوسری جانب فیض احمد فیض کی دینی سرشت سے بھی ہمیں متعارف کراتے ہیں۔ اپنے تنقیدی مقالات کے ایک اور مجموعہ بعنوان ''نعت اور تنقیدِ نعت'' میں شامل ایک اچھوتے موضوع پر اپنے انتہائی خیال انگیز مقالے ''غزل میں نعت کی جلوہ گری'' میں انہوں نے فیض احمد فیض کے فیضان کا برملا اعتراف کیا ہے۔

ہوا یوں کہ اُردو نعت گوئی کے موضوع پر ٹیلی ویژن کے ایک مذاکرے میں کشفی صاحب نے اس خیال کا اظہار فرمایا کہ ترقی پسند شعراء میں نعت گوئی کا رجحان مفقود ہے۔ جب محترمہ ہاجرہ مسرور کے گھر پر فیض احمد فیض سے ملاقات ہوئی تو کشفی صاحب نے فیض صاحب سے سوال کیا

کہ آپ مجھ سے کچھ ناراض ناراض سے لگتے ہیں؟ اس پر یہ کھلا کہ ترقی پسند شاعری کے اس محاکمہ سے فیض احمد فیض کی دل آزاری ہوئی تھی۔ چنانچہ کشفی صاحب لکھتے ہیں کہ:

''فیض صاحب نے سگریٹ کا ایک کش لیا اور پھر اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں کہنے لگے کہ جس ذات گرامی کے حوالے سے آپ نے ٹیلی ویژن پر اپنے غصے یا دوسروں کی کوتاہی کا جس طرح اظہار کیا تھا، اس انداز کا اس ذات سے کوئی علاقہ نہ تھا۔ کسی گنہ گار یا خطا کار کے کانوں میں جو بات کہنی چاہیے اس کو دنیا میں یوں پھیلانے کا خلق عظیم محمدیؐ سے کیا تعلق اور آپ تو ادب کے استاد ہیں۔ کیا آپ اپنے طالب علموں کو اس بت ہزار شیوہ سے متعارف نہیں کراتے جسے غزل کہتے ہیں۔ اگر آپ نے ہمدردی اور دل بیدار کے ساتھ میری غزلوں کا مطالعہ کیا ہوتا تو نعت کے اشعار مل جاتے اور اس مختصر گفتگو کے بعد فیض صاحب نے اپنا یہ شعر پڑھا:

شمعِ نظر، خیال کے انجم، جگر کے داغ
جتنے چراغ ہیں تری محفل سے آئے ہیں

اور شاید یہ فیض صاحب ہی کا فیضانِ نظر ہے کہ غزل کی ماہیت کا یہ پہلو مجھ پر روشن تر ہو گیا اور غالبًا یہ مضمون اسی گفتگو کا نتیجہ ہے''۔ (شمع اور تنقیدِ نعت، ص ۱۰۱ تا ۱۰۲)

کشفی صاحب کا کمال یہ ہے کہ وہ ترقی پسند اور جدید ادب کی تحریکوں پر اظہارِ خیال کرتے وقت ان تحریکوں کے محرکات و مقاصد اور اسلام دوستی کے تقاضوں میں کوئی بنیادی تضاد نہیں دیکھتے۔ عصری شاعری کی تحسین و تنقید پر مشتمل اپنی ایک اور تصنیف ''آدمی اور کتاب'' میں رقم طراز ہیں کہ:

ان سب کی روشنیاں الگ ہیں مگر ایک بات سب میں مشترک ہے۔ روشنیوں کے اس سلسلے میں ملت کی غم خواری اور دردمندی کا عنصر ضرور موجود ہے۔ علی سردار جعفری لاکھ اشتراکی تھے لیکن کربلا کی علامت ان کے ہاں انسان کی آبرو کا ذریعہ ہے۔ مجاز نے اپنی آزاد روی کے باوجود مشرق کے افق سے اس شرارے کو پھوٹتے دیکھا جس کا نام اسلام ہے۔ رشید احمد صدیقی کے دورِ آخر کی تحریروں میں اسلام کے ذہنی اور فکری کارناموں کی روشنی ایک کہکشاں بن گئی ہے اور آج سرور صاحب پر لکھتے ہوئے ان کے یہ استاد اور ہم عصر بے اختیار یاد آ گئے۔ (آدمی اور کتاب، ص ۶۵)

یہ قومی و ملی اندازِ نظر پہلے پہل اُن کی اوّلیں تحقیقی اور تنقیدی دستاویز ''اُردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پس منظر'' میں نمودار ہوا تھا۔ تب سے لے کر اپنے دمِ واپسیں تک وہ اُردو ادب میں قومی و

ملی اقدار کی تلاش و جستجو میں کوشاں رہے۔ یہ کتاب سیّد ابوالخیر کشفی کا ڈاکٹریٹ کا مقالہ ہے۔ آج سے لگ بھگ چالیس سال پیشتر جب وہ کراچی یونیورسٹی میں اس موضوع پر تحقیق و تفتیش میں منہمک تھے، تب کراچی یونیورسٹی میں ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی سے لے کر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں تک نامور اہلِ تحقیق و جستجو اور رمز شناسانِ ادب و شعر کی ایک کہکشاں جلوہ گر تھی۔ چنانچہ اس اچھوتے موضوع پر دادِ تحقیق دیتے وقت کشفی صاحب کو ان تمام ناموارانِ علم و ادب و تہذیب کا فیضان میسر تھا۔ اس تحقیقی مقالہ کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ اس میں اُردو تحقیق و تنقید کی تاریخ میں پہلی بار فقط قومی و ملی انحطاط اور دینی و اخلاقی زوال کے تجزیہ و تنقید کو کافی نہیں سمجھا گیا۔ کشفی صاحب نے جہاں شعر و ادب میں زوال و انحطاط کا عکس دیکھا اور دکھایا ہے وہاں اس زوال کو روکنے اور عروج میں بدلنے میں سرگرم کار افراد اور تحریکوں کو بھی تاریخی تناظر میں پیش کیا ہے۔ اس کتاب کا کینوس اورنگزیب کے نااہل جانشینوں کے ڈیڑھ صدی پر پھیلے ہوئے دورِ حکومت کو محیط ہے۔ کشفی صاحب کے خیال میں ''اسلام سے دوری اور مسلم کردار کا بحران اس زوال کا بنیادی سبب ہے۔'' اس عہد کی شاعری کا فنی، لسانی، فکری اور تمدنی تجزیہ کرتے وقت کشفی صاحب نے ٹیپو سلطان سے لے کر سن ستاون تک کی اُن تمام سیاسی اور جہادی تحریکوں کو پیش نظر رکھا ہے جو برصغیر میں مسلمانوں کے اقتدار کو قائم رکھنے کی خاطر ڈیڑھ سو سال تک وقتاً فوقتاً نمودار ہوتی اور دادِ شجاعت دیتی رہیں۔ اس ضمن میں اس دور کی اُردو غزل پر حریت اور جہاد کی تحریکوں کے اثرات کا مطالعہ انتہائی خیال انگیز ہے۔ حکیم مومن خاں مومن کی سیّد احمد شہید کی تحریکِ جہاد سے عملی وابستگی ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ کشفی صاحب نے فقط اُن کی مشہور ''مثنویٔ جہاد'' کی مثال کو کافی نہیں جانا بلکہ اُن کی پوری کلیات میں غوطہ زن ہو کر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ:

> ''ایک تحریک سے اپنی وابستگی کی بناء پر مومن اوّلین قومی شاعر کہلانے کے مستحق ہیں۔ مومن کی غزلوں کو اب تک محض ''شاہد بازاری و جمال پرستی'' تک محدود قرار دیا گیا ہے، لیکن ''تحریک سیّد احمد شہید'' کے باب میں مومن کی غزلوں کا مطالعہ ان کی شخصیت اور ذوقِ جہاد کی روشنی میں کیا گیا ہے''۔

اسی طرح جہاں انہوں نے دکنی شاعری جداگانہ مسلمان قومیت کے نظریے کے ابتدائی نقوش دریافت کیے ہیں وہاں انہوں نے ٹیپو سلطان شہید کی شان میں کی گئی عوامی شاعری میں اسلامی جذبہ و احساس کی نشاندہی کرتے وقت لکھا ہے کہ:

> ''نوحۂ ٹیپو سلطان'' ایک نامعلوم شاعر کی تخلیق ہے۔ اس نوحہ میں بھی اسلامی جذبہ موجود

ہے اور سلطان ٹیپو کی جنگ کو جہاد قرار دیا گیا ہے کیوں کہ اس نے دین احمدؐ کے لیے اپنی جان فدا کی''۔

ہر چند سیّد ابوالخیر کشفی کی یہ کتاب اپنے ادبی، تنقیدی اور تحقیقی محاسن کے اعتبار سے ایک ناقابل فراموش کارنامہ ہے تاہم اس کی ایک تاریخی اہمیت بھی ہے۔ اس کتاب میں پہلی بار ہمارے قومی و ملی تناظر اور جنگ پلاسی سے قیامِ پاکستان تک آزادی کی تحریکوں کے پس منظر میں اُردو شاعری کے تجزیہ وتحسین کا حق ادا کیا گیا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھیں تو یہ کتاب اُردو تحقیق و تنقید میں ایک رجحان ساز کتاب ثابت ہوئی ہے۔ سیّد ابوالخیر کشفی نے زیرنظر کتاب میں جو نئی راہ تراشی تھی اسی پر چلتے ہوئے خواجہ منظور حسین نے اپنی کتاب بعنوان ''تحریک جد و جہاد بطور موضوع سخن'' اور ڈاکٹر معین الدین عقیل نے اپنا تحقیقی شاہکار ''تحریک آزادی میں اُردو کا حصہ'' پیش کی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ راہ ایک مقبولِ عام شاہراہ بن جائے گی۔

☆☆☆☆☆